ڈاکٹر سید عامر سہیل
صدر، شعبۂ اُردو، یونیورسٹی آف سرگودھا
عابدہ نسیم
پی ایچ ڈی اسکالر، شعبۂ اُردو، یونیورسٹی آف سرگودھا

اُردو ناول میں مہاجرین کے سماجی مسائل کی پیش کش

Dr. AamirSohail
Head, Urdu Department,
Sargodha University, Sargodha
AabidaNasim
PhD Scholar, Urdu Department,
Sargodha University, Sargodha

A Study of Presentation of Social Issues of Migrants in Urdu Novel

Novel has a great versatility in its subjects/topics. Urdu Novelists has addressed all the human characters and activities in their novels. Migration is a great human activity. At the time of partition in 1947 a great migration took place. Almost 15 million people migrated to Pakistan. They faced a large number of social, political and psychological problems. In this paper novels are analyzed in the perspective of migration.

اصناف نثر میں ناول کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ اپنی وسعت اور ہمہ گیری کے باعث زندگی کو اس کی بے قلمونی اور ہما ہمی کے ساتھ پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا رخ ہو جو ناول کے دائرہ کار سے باہر ہو۔ ناول دراصل ایک سماجی دستاویز ہے جو کسی بھی عہد مخصوص کو ''جیسا کہ وہ ہے'' کی بنیاد پر محفوظ کرنے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ ناول کی اس دستاویزیت کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ ناول اپنے عہد کی سماجی و معاشرتی تاریخ ہوتا ہے۔ ناول اپنا خام مال معاصر تاریخ سے حاصل کرتا ہے تاہم ناول کو اس لیے تاریخ پر افضلیت حاصل ہے کہ تاریخ کا رخ عمودی اور جزوی ہوتا ہے جب کہ ناول کا رخ افقی اور کلیت آمیز ہوتا ہے۔

تقسیم ہند اور مہاجرت برصغیر ہندو پاک کی تاریخ کا ایک ایسا سنگ میل ہے جس کے اثرات تا حال ہمارے معاشرے پر ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں دنیا کی سب سے بڑی ہجرت رونما ہوئی۔ تقریباً سوا کروڑ افراد ادھر سے اُدھر

ہوئے ۔سفاکانہ قتل و غارت ہوئی ۔ایسے ایسے فسادات رونما ہوئے انسانی ذہن جن کا تصور کرنے سے قاصر ہے۔ تاریخ ہندوستان کا اتنا بڑا واقعہ اردو ناول کی روایت پر بے حد اثر انداز ہوا اور اردو ناول نے اپنی معاصر تاریخ کے اس غیر معمولی واقعہ کی بھرپور نمائندگی کی ۔تمام نمائندہ ناول نگاروں نے تقسیم ہند کے موضوع کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا۔

مختلف لکھنے والوں نے مختلف زاویہ ہائے نظر سے اس تاریخی واقعے کی واقعیت، پس منظر اور ردعمل کا جائزہ لیا اور اس کے مضمرات کا کھوج لگانے کی سعی کی۔ تقسیم کے فوراً بعد اور اس کے کئی دہائیاں بعد تک بھی اس موضوع پر ناول لکھے جاتے رہے۔ اس حوالے سے جو نمایاں ناول نگار سامنے آئے ہیں ان میں قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، عبداللہ حسین، شوکت صدیقی، انتظار حسین اور الطاف فاطمہ کے نام شامل ہیں۔

کیمپوں میں مہاجرین کا قیام ایک عارضی اور فوری نوعیت کا مسئلہ تھا۔ جسے تقریباً سبھی ناول نگاروں نے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض مصنفین کی پیش کردہ تصویر سے یہی تاثر ابھرتا ہے کہ کیمپوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ یہ معاملہ حکومتی مشینری کے بس سے باہر ہو گیا تھا اور کیمپ بیماری، بھوک اور غلاظت کی آماج گاہ تھے۔ بعض ناول نگاروں نے یہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ حکومتی اہل کار اپنے فرائض میں کوتاہی اور بعض اوقات مجرمانہ غفلت سے کام لیتے تھے۔ تاہم لاہور کے حوالے سے اکثر ناول نگاروں نے اہل لاہور کی محبت اور گرم جوشی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ انتظار حسین نے ''بستی'' میں اہل لاہور کے اس جذبے کو سراہا ہے کہ اہل لاہور دل کھول کر مہاجرین کی مدد کرتے اور مہاجرین بھی ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے۔ اگر ایک کو مکان مل جاتا تو وہ گنجائش سے زیادہ لوگوں کو اپنے ہاں پناہ دے دیتا۔'' وہ دن اچھے ہی تھے، اچھے اور سچے، وہ دن یاد رکھنے چاہییں۔ بلکہ قلم بند کر لینے چاہییں کہ مبادا ذہن سے پھر اتر نہ جائیں۔[۱]

قیام پاکستان کے بعد سماجی معیارات تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ ایک جمے جمائے معاشرے میں اپنی حیثیت سے الگ ہو جانے کے بعد مہاجرین کی سماجی حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ انھیں نئے معاشرے میں نئے سرے سے سماجی شناخت قائم کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ عزت، شرافت، نجابت، غربت اور امارت کے پیمانے یک سر تبدیل ہو گئے۔ بڑی بڑی جاگیروں کے مالک، کشادہ حویلیوں اور کوٹھیوں میں رہنے والے کئی ایسے افراد بھی تھے جو کوارٹروں اور جھگیوں میں پڑے تھے۔ کئی ایسے بھی تھے جو تقسیم سے قبل معمولی زندگی بسر کر رہے تھے مگر اس انقلاب نے ان کی زندگی سنوار دی۔ بڑے بڑے مکان مل گئے، جاگیریں اور کارخانے الاٹ ہو گئے۔ بعض کلیموں کے پیچھے جوتیاں چٹخاتے پھر رہے تھے اور بعض راتوں رات امیر ہو رہے تھے۔ یہ ایک نوتشکیل پذیر معاشرے کی تصویر ہے۔ جس کے معیارات ابھی طے ہو رہے تھے۔ نفسانفسی کا عالم تھا اور کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ ہر کوئی اپنی زندگی بنانے کے چکر میں تھا اور اس دوڑ میں دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ ناول نگاروں نے ان تمام صورتوں کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

''چلتا مسافر'' کا مرکزی کردار ایک بہاری سید ہے جو تقسیم کے وقت ایک نوجوان، متحرک اور سرگرم سیاسی کارکن تھا۔ علی گڑھ کا انعام یافتہ ذہین طالب علم تھا اور خوش حال گھرانے کا فرد تھا۔ تقسیم کے بعد جب سیاسی و سماجی حالات رفتہ رفتہ گھمبیر ہوتے چلے

گئے اور بنگالیوں کا تعصب بڑھتا گیا تو اس صورت حال نے اسے اپنی ذات کے خول میں سمٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح اس کے اور مقامی معاشرے کے مابین فاصلے کی خلیج پیدا ہوگئی اور جس نے جذب و ہم آہنگی کے عمل کو شدید متاثر کیا۔ یہی فرد جب اس معاشرے میں آیا تھا تو بقول بنگالیوں کے کتنا سندر تھا۔ بالکل سونے کی ڈلی تھا۔ ہنسنے کو دانت نکالتا تھا تو باپ رے بجلی سی کوند جاتی تھی۔ اب رفتہ رفتہ اتنا ناپسندیدہ ہو گیا کہ لوگ اسے قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ مقامیوں کے نزدیک وہ ایک شریر آدمی ہے جس نے اپنی بھابھی سے شادی کر رکھی ہے۔ اور جس نے یونیورسٹی میں ادھم کاٹا ہوا تھا اور جو مسلم لیگ کا غنڈہ تھا۔[۲]

مشرقی پاکستان میں قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد ہی تعصب نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی کیا وجوہات تھیں یہ ایک الگ بحث ہے تاہم اس تعصب اور منافرت کی فضا نے مہاجرین کو عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کر دیا۔ وہ سرزمین جس کی خاطر انھوں نے قربانیاں دیں، اپنا گھر بار چھوڑا۔ اب ان کے لیے اجنبی تھی اور وہاں کے باسی انھیں اپنا ماننے کو تیار نہ تھے۔

مہاجر اور مقامی کے مابین جذب و ہم آہنگی کے حوالے سے شہر اور دیہات کا فرق ایک اہم اور قابل ذکر عنصر ہے۔ مہاجر اور مقامی کے مابین عدم انجذاب یا عدم اشتراک اور ثقافتی و سماجی تفاوت کی صورت بڑے شہروں میں زیادہ پیدا ہوئی۔ بالخصوص وہ مہاجرین اس مسئلے سے دوچار ہوئے جو بڑے شہروں اور بالخصوص یوپی سے آئے تھے۔ اس کے برعکس پنجاب سے، چھوٹے شہروں اور قصبوں سے آنے والے مہاجرین جلد ہی مقامیوں میں گھل مل گئے اور اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ دیہات اور زرعی سماج میں زندگی اپنے فطری انداز میں گزرتی ہے اور فطرت سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ اس لیے دیہی سماج کا فرد فطرت اور زمین سے جڑا ہوتا ہے اور زیادہ دیر تک دھرتی سے اپنا ناطہ توڑے ہوئے نہیں رہ سکتا اور زمین کی کشش اسے بہت جلد مائل کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیہاتوں میں آنے والے مہاجرین نے اس زمین کو اپنانے میں کوئی تامل نہیں کیا۔

عبداللہ حسین کے ناول ''نادار لوگ'' کا یعقوب اعوان بھی ایک پنجابی مہاجر ہے جو ساڑھے بارہ کلے کا مالک ہے۔ اسے یوپی کا اردو سپیکنگ بنا کے کلیم میں ردو بدل کر کے ایک بڑی جاگیر ہتھیانے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے لیکن یعقوب اعوان ساڑھے بارہ ایکڑ پر ہی اڑا رہتا ہے۔ یہ حقیقت یعقوب کی مٹی سے محبت اور وفاداری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ دس مربعوں کی اتنی بڑی ترغیب بھی اس کے پائے استقلال میں لغزش نہیں ڈال سکتی۔ تقسیم کا عمل اسے زیادہ متاثر نہیں کرتا اور وہ پہلے کی طرح کھیتی باڑی میں مصروف ہو جاتا ہے[۳]۔ اس کے دونوں بیٹے بھی اس کی طرح محبِّ وطن اور زمین کے وفادار تھے۔ بڑا بیٹا ایف اے کر کے سکول ماسٹر بن جاتا ہے مگر وہ ایک اچھا انسان بھی ہوتا ہے۔ وہ خوب محنت کرتا ہے اور جلد ہی اپنے گاؤں کا ایک بااثر زمین دار بن جاتا ہے۔ تاہم اس کی خوش حالی اسے غرور اور چھچھورے پن کا شکار نہیں کرتی اور وہ اپنی تعلیم اور انسان دوستی کے باعث گاؤں کا ایک اہم، معتبر اور ہر دل عزیز کردار بن جاتا ہے۔ وہ غریبوں سے ہم دردی کرتا ہے، ان کے مسائل میں دل چسپی لیتا ہے اور اس چیز نے اس کے کردار کو بڑا متحمل اور متوازن بنا دیا ہے۔ وہ یونین ورکر بن جاتا ہے، مگر اس چیز کو اپنی شہرت اور دولت کے حصول کا ذریعہ نہیں بناتا۔ وہ بنیادی طور پر کسان ہے اور مٹی سے محبت کرنے والا ہے۔ اس لیے پارٹی ورکر اور یونین لیڈر بن جانے کے بعد بھی وہ جبلی طور پر کسان ہی رہتا ہے۔ کسان ابن کسان۔[۴]

پنجاب کے شہری معاشرے میں بھی زیادہ مسائل دیکھنے میں نہیں آئے۔ بہت سے مہاجرین ایسے بھی تھے جنھوں نے آتے ہی اس سرزمین کو اپنا لیا اور پاکستان کو اپنے خوابوں کی سرزمین جانا جس نے انھیں پناہ دی تھی، تحفظ بخشا تھا۔ ''بستی'' کا ذاکر جب پہلی دفعہ اس سرزمین پر چلتا ہے تو ایسے ہی تجربے سے گزرتا ہے۔ کتنے زمانے بعد وہ آزادنہ چل رہا تھا اس اندیشے کے بغیر کہ ابھی کوئی برابر سے گزرتے گزرتے چھرا اس کے اندر اتار دے گا[۵]۔ اہل لاہور کے جذبہ خیر سگالی کی طرف بھی انتظار حسین نے اشارہ کیا ہے۔ اہل لاہور نے بانہیں وا کر کے مہاجرین کو قبول کیا، انھیں اپنے ہاں پناہ دی اور اپنا سب کچھ وقف کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور میں مہاجرین کی آبادکاری کے حوالے سے کوئی مسئلہ میں کو نہیں آیا۔[۶]

قیام پاکستان کے بعد جب نئے سماجی معیارات کی تشکیل ہوئی اور نیا طبقاتی نظام وجود میں آیا تو لوگوں کی سماجی حیثیت کی کایا کلپ ہوئی اور سماجی شناختوں کا ایک نیا عمل ظہور میں آیا۔ بہت سے ایسے افراد جو پہلے معاشرے کے اہم اور معزز فرد سمجھے جاتے تھے۔ معاشرے میں بے وقعت ہو کر رہ گئے۔ اور متعدد ایسے افراد تھے جن کی پہلے کے معاشرے میں کوئی قابل ذکر حیثیت نہ تھی نئے معاشرے مین طبقہ اعلیٰ کے نمائندگان تصور کیے جانے لگے۔ قرۃ العین حیدر نے کراچی کے تناظر میں اسی صورت حال کا نقشہ پیش کیا ہے۔ (تاہم ان کی یہ تصویر حقیقی سے زیادہ مبنی پر تعصب معلوم ہوتی ہے)

''دوسرا طبقہ اعلیٰ طبقہ کہلاتا ہے۔ پچھلے نو سال میں بے حد مستحکم ہو چکا ہے اور محتاج تعارف نہیں .....یعنی کل جو صاحب گم نام اور ہما شما قسم کے آدمی تھے۔ آج وہ مرکزی وزیر ہیں کروڑ پتی یا بہت مشہور لیڈر۔ پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ نہایت ادق بین الاقوامی مسائل پر اس فراٹے سے بیان دیتے ہیں کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ انتہائی معمولی قابلیت کے حضرات اقوام متحدہ اور دوسرے بڑے عالم گیر اداروں میں ملک کی نمائندگی کرتے ہیں اور ہاؤلرز کہتے ہیں، مگر کوئی برا نہیں مانتا۔ ان گنت خواتین و حضرات اندھوں میں کانا راجا بنے بیٹھے ہیں- پاکستان کی بیگمات بھی دنیا کی عجائبات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی ساریاں، ان کے زیورات، ان کے ڈنر اور پارٹیاں، بیرونی ممالک کے سفر، ان کی زندگی کے عکاس اور گویا ان کا پروفیشنل آرگن ماہ نامہ ''مرر'' جس میں ان کی دعوتوں کی تصویریں چھپتی ہیں۔ تب اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان دراصل کس قدر ترقی یافتہ اور دولت مند ملک ہے۔ جس کی آدھی آبادی صرف ڈنر اور ایٹ ہوم کھاتی ہے اور سیمیانا چتی ہے۔''[۷]

قرۃ العین حیدر نے کراچی میں مہاجرت کے نتیجے میں تشکیل پذیر ہونے والے نئے سماجی ڈھانچے کی تصویر خاصے تشویش ناک انداز میں کھینچی ہے۔ انھوں نے اس سماج کی خامیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مطابق اس نو تشکیل پذیر معاشرے میں ہر طرف کرپشن ہی کرپشن ہے۔ سب سے زیادہ مسائل کا سامنا مہاجرین کی مڈل کلاس کو کرنا پڑ رہا ہے۔ کوئی کام بھی سفارش کے بغیر نہیں ہوتا۔ لوگوں کو ملازمتیں نہیں ملتیں اگر کسی کو مل جائے تو ترقی نہیں ہوتی، نہ بچوں کو سکول کالج میں داخلہ ملتا ہے۔ ہر طرف بدانتظامی اور افراتفری کا عالم ہے۔[۸]

مصنفہ نے دکھایا ہے کہ نئے معاشرے کے قیام کے ساتھ ہی لوگوں کی تہذیبی سرگرمیاں بھی کھوکھلی اور مصنوعی تھیں۔ ملک میں کسی صحت مند تہذیب و معاشرت کی تعمیر نہیں کی جا رہی تھی۔ ہر طرف انتشار اور بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ گویا پاکستان اپنے قیام

کے ساتھ ہی انحطاط کی راہ پر چل نکلا تھا۔

انتظار حسین نے ''بستی'' میں قیام پاکستان کے دو دہائیاں بعد کے سیاسی وسماجی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے دکھایا ہے کہ مہاجرین لٹ لٹا کر اور اپنا سب کچھ چھوڑ پر پاکستان آئے تھے اور انھوں نے پاکستان کو دارالسلام جانا اور اسے خوابوں کی سر زمین تصور کیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے آغاز ہی میں پاکستان کی باگ ڈور نااہل اور خودغرض لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی اور انھوں نے ملک کو تباہی کی طرف دھکیل دیا۔ مہاجرین کے خواب چکنا چور ہو گئے۔ وہ غیروں کے ڈسے ہوئے یہاں امن، سکون، محبت اور تحفظ کی تلاش میں آئے تھے۔ لیکن یہاں اپنے ملک میں آ کر بھی اپنوں کے پاس رہ کر بھی وہی خوف، عدم تحفظ اور بدحالی و بدتنظیمی کی فضا قائم تھی۔ اس صورت حال نے مہاجرین کو شدید اذیت پہنچائی وہ داخلی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہو گئے۔ اقدار کی مسلسل شکست و ریخت، سماجی بے حسی، خودغرضی اور سیاسی بے سمتی نے انھیں سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں رہ رہے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ بستی کا بہت سارا حصہ اصل میں اسی انسان کی روداد ہے جس کی کایا کلپ ہو چکی ہے۔ اور جو اس وجود کا متلاشی ہے جو آغاز سفر میں تھا۔ ذیل کا اقتباس اسی سماجی بے حسی اور بدصورتی کا اظہار یہ ہے۔

> ''الاٹ منٹ ہونے والی ہے میں نے نقشہ تیار کر لیا ہے۔ ایک مربعے میں گلاب کے تختے ہوں گے..... یار پاکستان میں پھول بہت کم ہو گئے ہیں جب ہی تو لوگ بدصورت ہوتے جا رہے ہیں اور نفرت پھیلتی جا رہی ہے۔ میں نے سوچا ان بدبختوں کی صورتوں کو مسخ ہونے سے بچایا جائے..... دو مربعوں میں آموں کا باغ ہوگا۔ یار بات یہ ہے کہ مکروہ آوازیں سن سن کر میری سماعت خراب ہو گئی ہے۔ آموں کا باغ ہوگا تو کوئل کی آواز تو سنائی دے گی۔''[۹]

ڈاکٹر افضال بٹ اس صورت حال کے حوالے سے کہتے ہیں کہ مصنف تخلیق پاکستان کے مقاصد سے مایوس نظر آتے ہیں۔ جلسے جلوس، تخریب کاری اور توڑ پھوڑ میں تو اس نئے ملک کی بقا کی نہیں تھی۔ اس قوم کو تو مساوات، بھائی چارے اور غیر طبقاتی سماج کا آئینہ دار ہونا چاہیے تھا۔ یہاں تو مذہبی، لسانی اور گروہی لڑائیاں لڑی جا رہی ہیں۔ یہ قوم کس سمت میں جا رہی ہے[۱۰] اس دور میں بے حسی، خودغرضی اور نفسانفسی کا یہ عالم تھا کہ لوگ اپنے محسنوں کو بھی دغا دے جاتے۔ یہ رویہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ بعض اوقات وہ شخص جو جذبہ ہم دردی کے تحت دوسروں کو پناہ دیتا ہے اور میزبانی کرتا ہے آخر میں بے دخل کر دیا جاتا اور بعد میں آنے والے مہاجرین میں سے کوئی چالاک شخص مکان اپنے نام الاٹ کروالیتا۔ ''بستی'' میں ایک ایسی ہی صورت حال دکھائی گئی ہے کہ صاحب خانہ سب سے پہلے اس مکان میں پہنچا تھا اور اس نے بعد ازاں اپنی بستی کے تمام لوگوں کو اپنے گھر میں پناہ دی اور جب تک کسی کے گھر کا بندوبست نہ ہو جاتا وہ اس کے گھر میں پڑا رہتا۔ لیکن ایک دن اس کے مہمانوں میں سے منشی مصیب حسین مل ملا کر کلیم بنوالائے اور اپنے میزبان کو نکلنے پر مجبور کر دیا۔[۱۱]

ناول کا مرکزی کردار ''ذاکر'' بھی اسی گھر میں پناہ گزین تھا۔ مجبوراً اسے بھی وہ گھر چھوڑنا پڑا۔ ''یہاں آ کے تو لوگوں کی آنکھوں کا پانی مر گیا تجھے تو کیا یاد ہوگا جب تیرے دادا ابا زندہ تھے تو یہ منشی مصیب حسین ہماڑی ڈیوڑھی نہیں چھوڑتے تھے۔ اللہ

کی شان کہ اب ہمیں آنکھیں دکھاتے ہیں۔'' [۱۲]

سماجی معیارات تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ شرفا در بہ در پھر رہے تھے دفتروں میں جوتیاں چٹخار رہے تھے جب کہ چالاک اور طرار قسم کے لوگ دونوں ہاتھوں سے گھر بھر رہے تھے۔ منشی مصیب ایسے ہی طبقے کا نمائندہ ہے جنھوں نے اپنی شاطرانہ طبیعت کے بل بوتے پر یہاں سماجی رتبہ حاصل کر لیا ہے۔ اور نو دولیتے بن بیٹھے۔

ایک اور سماجی مسئلہ جو مہاجرین کو درپیش ہوا وہ تھا سماجی ڈھانچے کا انتشار۔ بٹوارے سے ایک جما جمایا معاشرہ اپنی جگہ سے اکھڑ گیا اور خاندان تقسیم ہو کر رہ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک پورا سماجی نظام انہدام پذیر ہو گیا۔ نئے ملک میں نئے سماج کی تشکیل کے ساتھ ساتھ مہاجرین کو نئے سرے سے سماجی روابط قائم کرنا پڑے۔ پہلے سے قائم شدہ معاشرے کے انہدام کے ساتھ سماجی رشتوں میں بھی فرق آ گیا تھا۔ نئے ملک میں پہلے سے موجود لوگوں کا ایک اپنا سماجی اور معاشرتی نظام تھا اس معاشرتی تنظیم میں مہاجرین کو اپنی جگہ بنانا تھی۔ علاوہ ازیں مہاجرین کی اپنی سماجی حیثیت اور تقسیم سے قبل کے باہمی تعلقات کی نوعیت بھی تبدیل ہو چکی تھی۔ ایک جگہ سے آنے والے یا مختلف مقامات سے آنے والے مہاجرین کے آپسی تعلقات کی بھی از سرِ نو تشکیل ہوئی۔ مہاجرین اور مقامیوں کے رویے ان سماجی رشتوں کی تشکیل پر مسلسل اثر انداز ہوتے رہے۔ اس ضمن میں متعدد اور متنوع رویے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

''دستک نہ دو'' میں ایسے ہی اس مسئلے کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک خوش حال جاگیردار گھرانے کی بیگم صاحبہ جنھیں اپنی دولت، جاگیر اور خاندانی حسب نسب کا بہت لحاظ رہتا ہے اور بہت طنطنے اور کروفر کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہیں۔ وہ اپنے سسرالیوں کو منہ نہیں لگاتیں اور اپنے میکے پر بہت اتراتی ہیں۔ وہ اپنے لڑکے کی خواہش کے باوجود اس کی شادی اپنے دیور کے گھر میں نہیں ہونے دیتیں اور اسے منظر سے ہٹانے کے لیے باہر بھیج دیتی ہیں جہاں وہ عالمی جنگ کی نذر ہو جاتا ہے۔ مگر جب یہی بیگم صاحبہ ہجرت اور تقسیم کے کرب سے گزرتی ہیں اور لٹ لٹا کر معمولی حیثیت پر آ جاتی ہیں تو اسی دیورانی کے ہاں دوسرے لڑکے کی شادی کی متمنی ہوتی ہیں، مگر اب سماجی معیارات تبدیل ہو گئے تھے۔ اب دیورانی برابر کی سطح پر بلکہ بہتر سطح پر تھیں اس لیے وہ رشتہ جوڑنے سے صاف انکاری ہو جاتی ہیں۔ ''جب کچھ تھا تو ہم میں اور ہماری اولاد میں کیڑے تھے اب خاک پر بسم اللہ ہو گئی تو طلعت یاد آ رہی ہے۔ شہریار تو قربان ہو گئے طنطنے پر سے اب طلعت کیسے یاد آ گئی ہے۔'' [۱۳]

مہاجرین کا ایک سماجی مسئلہ یہ بھی تھا کہ ان کا مستقبل غیر یقینی صورت حال سے دوچار تھا۔ ان کی منزل واضح نہ تھی۔ ان میں بہت سے ایسے افراد بھی تھے جو نہایت، ذہین، قابل اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ اگر انھیں ایک پرسکون معاشرے میں رہنے کا موقع ملتا تو وہ اپنی لیاقت کی بنا پر ایک اعلیٰ مستقبل کی تعمیر کرتے لیکن مہاجرت کے باعث ان کی لیاقت و قابلیت کو گھن لگ گیا۔ اپنی جڑ سے اکھڑ جانے اور نئے معاشرے میں ڈانواں ڈول کیفیت نے انھیں معاشرے میں کوئی کامیاب اور مفید کردار ادا کرنے یا اعلیٰ مستقبل تعمیر کرنے سے باز رکھا اور عام اور معمولی افراد جیسی زندگی بسر کرنے لگے۔ اس مسئلے کا سب سے زیادہ شکار تو مہاجرین کا نوجوان طبقہ ہوا تاہم مہاجرین کی ایک اگلی نسل بھی بعض اوقات اس امر سے شدید متاثر ہوئی۔

''چلتا مسافر'' میں مزمل اس مسئلے سے دوچار نظر آتا ہے۔ مہاجرت سے قبل وہ علی گڑھ کا گولڈ میڈلسٹ اور تحریک پاکستان کا سرگرم رکن تھا مگر مہاجرت کے بعد وہ ایک تھکا ماندہ، گم صم اور شل اعصاب کا حامل فرد بن کر رہ گیا۔ وہ اپنے لیے کسی اچھے مستقبل کی تعمیر نہ کر سکا اور اس کی تعلیم اور قابلیت ضائع ہوگئی۔ وہ زندگی بھر ایک معمولی سی دکان چلاتا رہا۔ یہی حال اس کی بیوی کا تھا، وہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی مگر اب محض ایک روایتی اور معمولی عورت بن کر رہ گئی تھی۔

> ''اس عورت نے پولیٹیکل سائنس لی تھی اور کیا انگریزی بولتی ہے جب بولنے پر آتی ہے اور خالو جان (مزمل) کیا کم ہیں۔ کسی سبجیکٹ پر بات کر لو ایک دریا سا بہتا چلا آتا ہے..... اندر سے۔ ذرا قدر نہ کی ان لوگوں نے اپنی مٹی میں ملا دیا ہے اپنے آپ کو۔ ارے زمانہ کیا قدر کرے گا کسی کی۔ کرنا ہو تو انسان اپنی قدر خود ہی کرے۔'' [۱۴]

یہ مسئلہ نہ صرف ان لوگوں کے ساتھ تھا بلکہ ان کی اولاد جوان حالات میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی وہ بھی اس مسئلے سے شدید متاثر نظر آتی ہے۔ حالات کے پیش نظر مزمل کو اپنی بیوہ بھابھی سے شادی کرنا پڑی تھی۔ وہ دو بچوں کی ماں تھی اور تیسری اولاد مزمل کی پیدا ہوئی۔ مزمل کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ وہ اپنے مرحوم بھائی کی لاڈلی اولاد کو اور اپنے بچے کو اچھی زندگی فراہم نہ کر سکا اور اس کی وجہ سے ان بچوں کا مستقبل بھی تاریک ہوگیا۔ ''کیا دیا میں نے ان کو، منودس دس، بیس بیس روپے کی ٹیوشنیں کرتا پھرتا تھا۔ لڑکی کو چار جوڑوں سے رخصت کیا۔'' [۱۵] تیسرا لڑکا مدثر ڈھاکہ یونی ورسٹی میں ایم ایس سی کا طالب علم تھا، اس کی تعلیم سیاست کی نذر ہوگئی۔ یونی ورسٹی سیاست کا گڑھ بن چکی تھی اور پروفیسر سیاست پر لیکچر دیتے تھے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کی کشاکش میں مدثر کا مستقبل بھی تباہ ہوگیا۔ وہ مہاجر بن کر پاکستان آیا اور فیکٹری میں مزدوری کرنے پر مجبور ہوگیا۔ [۱۶]

مہاجرین کو درپیش مسائل میں سے معاشی مسئلہ سب سے بنیادی اور حساس نوعیت کا تھا۔ یہ ان کی بقا کا مسئلہ تھا اور زندہ رہنے کے لیے بہر حال انھیں دو وقت کی روٹی درکار تھی۔ دونوں طرح کے مہاجرین کو نئے ملک میں قدم جمانے اور زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے وسیلہ روزگار کی ضرورت تھی۔ بہت کم مہاجرین ایسے تھے جو صحیح وسلامت پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ مہاجرین کی اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل تھی، جو گھر سے توزادِ راہ اور اہل خانہ کے ساتھ نکلے مگر منزل تک پہنچتے پہنچتے مال واسباب لٹ گیا اور خاندان کے بیشتر افراد مارے گئے۔ جو لوگ پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوتے وہ پریشانی، صدمے، بھوک اور بیماری سے بے حال ہوتے اور ان کی ذہنی اور جسمانی حالت اس قابل نہ تھی کہ وہ آتے ہی اپنا معاشی بوجھ خود اٹھا سکتے۔ تاہم ان کا یہ جذبہ قابل داد ہے کہ وہ آتے ہی زندگی کی جدوجہد میں جت گئے۔

''چلتا مسافر'' میں دکھایا گیا ہے کہ سید صاحب ایک خوش حال زمین دار تھے اور اپنی آمدن کا بیشتر حصہ تحریک پاکستان کی نذر کر دیتے تھے۔ سید صاحب اور بڑے لڑکے کے فسادات میں کھپ جانے کے بعد چھوٹا لڑکا خواتین اور بچوں کو لے کر گرتا پڑتا مشرقی پاکستان پہنچا۔ فسادات اور مہاجرت کے عمل سے گزر کر اس کا ذہن ماؤف اور احساسات اس قدر کند ہو جاتے ہیں کہ وہ کسی سے مدد کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتا۔ ''بے روزگاری، تیزی سے خرچ ہوتیہوئی رقم محکمہ بحالیات کا دیا ہوا وہ چھوٹا سا پرزہ

جس کے تحت وہ گھنشیام کے اس متروکہ مکان کا تالا توڑ کر چھت تلے بیٹھا ہے اور وہ تو یہ بھی نہ ملتا جو مسلم لیگ کے بعض کارکن اس کو پہچان نہ لیتے کہ وہ سید صاحب کا لڑکا ہے۔ نہ کسی نے اس کی داستان پوچھی نہ سنانے کو اس کے لب ہلے۔[۱۷]

علی گڑھ کے گولڈ میڈلسٹ مزمل کا مستقبل غتر بود ہو جاتا ہے۔ وہ ایک دکان پر معمولی ملازم ہو جاتا ہیمگر اسے جلد ہی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں کیوں کہ وہ ذہنی طور پر بہت پریشان تھا اور حساب کتاب میں بہت غلطیاں کرتا تھا۔[۱۸] اس کے بعد وہ خود پرچون کی چھوٹی سی دکان بنا لیتا ہے لیکن اس کے مزاج اور سرمائے کے پیش نظر دکان بھی خاطر خواہ نہیں چلتی ۔مشرقی پاکستان کے حالات رفتہ رفتہ خراب ہوتے جا رہے تھے اور بنگالیوں نے بہاریوں کا معاشی بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ مہنگائی روز بروز بڑھ رہی تھی اور مزمل کے لیے گھر کا گزارہ چلانا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی ماں شوگر کی مریض ہو گئی تھی لیکن مناسب علاج اور خوراک نہ ملنے کے باعث وقت سے پہلے بوڑھی ہو رہی تھی۔[۱۹]

الاٹ منٹ کے مسائل میں سب سے اہم مسئلہ جعلی کلیم کا تھا۔ بعض لوگ ایسے بھی تھے جو سرے سے مہاجر ہی نہ ہوتے مگر بعض مہاجرین کو بہلا پھسلا کر ان کے کلیم میں اپنی مرضی کا ردو بدل کروا لیتے اور پھر افسروں کو کچھ دے دلا کر یا ذات برادری کی بنا پر وہ کلیم منظور کروا لیتے اور بعد ازاں مطلوبہ جاگیر کے حصے آپس میں بانٹ لیے جاتے۔ ''نادار لوگ'' میں عبداللہ حسین نے ایسی ہی صورت حال دکھانے کی کوشش کی ہے۔

یعقوب اعوان امرتسر کا مہاجر ہے۔ تقسیم کے بعد وہ سرحد پار کر کے اپنے سسرالی اعوانوں کی بستی میں پناہ گزیں ہوا۔ سابقہ گاؤں میں اس کے ساڑھے بارہ ایکڑ اراضی تھی۔ جب وہ اس اراضی کا کلیم بنوانے کی کوشش کر رہا تھا تو گاؤں کے زمین دار اسے سمجھاتے ہیں کہ یہاں بہت سی متروکہ زمین خالی پڑی ہے، اگر تو ساتھ دے تو ہم اس پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ مصنف نے اس حوالے سے یہ بھی دکھایا ہے کہ بحالیات کے محکمے میں نیچے سے اوپر کی آسامی تک ایسے کئی افراد مل جاتے تھے جو چند پیسوں کی خاطر کاغذات میں ردو بدل کر دیتے تھے۔[۲۰]

الاٹ منٹ کے حوالے سے ایک قانون یہ بھی تھا کہ مشرقی پنجاب کے مہاجر کے لیے کلیم کے اصلی کاغذات مہیا کرنا ضروری تھا جب کہ یوپی کے مہاجر کو ایک سادہ حلفیہ بیان کے ذریعے ہی بیس پچیس ہزار یونٹ جائیداد الاٹ کر دی جاتی تھی۔ اس صورت حال کا فائدہ اٹھا کر بہت سے لوگوں نے یوپی کا مہاجر بن کر ناجائز کلیم کروائے۔ مذکورہ بالا ناول میں یعقوب اعوان کے سسرالی جب اس کی مدد سے کام نکلوانے میں ناکام رہتے ہیں تو وہ یوپی کا اصلی مہاجر غیاث الدین انصاری تلاش کر لیتے ہیں اور اس کے ساتھ ملی بھگت کر کے بہت بڑی حویلی اور کئی مربع زمین الاٹ کروا لیتے ہیں[۲۱]۔ عبداللہ حسین نے محکمہ بحالیات کی اس دھاندلی اور کرپشن پر سخت تنقید کی ہے اور حقیقی مہاجرین کا استحصال کرنے والی طاقتوں پر سوالیہ نشان لگایا ہے۔[۲۲]

مہاجرین کے معاشی مسائل کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ ایسے متعدد لوگ تھے جن کو یہ شکایت تھی کہ یہاں آ کر ان کو اپنے روزگار کا درست نعم البدل نہیں مل سکا۔ اور ان کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ محکمہ بحالیات والے ان کے مسائل پر توجہ نہیں دیتے اور وہ دفاتر کے چکر لگا لگا کر تھک گئے ہیں اور اب اپنی مدد آپ کے تحت چھوٹے موٹے کام کرنے پر مجبور ہیں۔ امرتسر

میں میرا بہت بڑا ہوٹل تھا یہاں کا بک میں بیٹھا ہوں اور پھر بھی الاٹ منٹ والے آ کے تنگ کرتے ہیں۔[۲۳]

جائیدادوں اور املاک کے تبادلے اور الاٹ منٹ کا کام اس قدر پیچیدہ اور الجھا ہوا تھا کہ متعلقہ افسران بدحواس ہو کر رہ جاتے۔انتظار حسین نے ''چاند گہن'' میں محکمے کی اس بدحواسی، بدانتظامی اور بے بسی کو ایک دل چسپ زاویے پیش کیا ہے۔سبطین ایک تعلیم یافتہ اور ذہین شخص ہے اور اپنے خیالات و افکار کے ذریعے قوم کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔تقسیم سے قبل وہ کالج کا پروفیسر بھی رہ چکا ہے اور صحافی بھی۔لاہور آ کر اس نے پھر سے صحافت کا کام شروع کرنے کا منصوبہ بنایا اور محکمہ بحالیات کو پریس کے لیے درخواست دی۔

> ''دفتر کے ہر کلرک کی میز پر دستک دی گئی اور ہر افسر سے ملاقات کی گئی.....اس مہم کا خاتمہ بالخیر یوں ہوا کہ وہ پریس ایک مہاجر دھوبی کو الاٹ ہوا۔سبطین نے جب بہت ہائے توبہ مچائی تو اسے ایک لانڈری الاٹ کر دی گئی۔سبطین یوں بھی مطمئن تھا کہ اس کی آمدنی سے اخبار چلایا جا سکتا ہے۔ مگر ایک انگریز اس کے پیچھے پڑ گیا اور بڑے افسروں تک بات پہنچا دی کہ سبطین کا اس کام سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا اور سبطین نے یہ کمال کیا کہ وقت مقررہ پر لانڈری کا قبصہ لینے نہیں پہنچا یوں آئی چیز اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔''[۲۴]

آخر کار سبطین نے اپنی مدد آپ کے تحت ہفت روزہ پرچہ نکالنا شروع کیا اور دن رات محنت کی مگر کسی صورت کامیابی نہ ہوئی۔سبطین کو گھر کی بجلی تک کٹوانا پڑی کیوں کہ بل کی ادائیگی کے لیے اس کے پاس اتنی رقم نہ تھی[۲۵]مصنف نے یہ دکھایا ہے کہ محکمہ بحالیات کا نظام اس قدر بدنظمی کا شکار تھا کہ صورت حال خود ان کے اپنے بس سے باہر تھی۔وہ یہ جانے بوجھے بغیر کہ کون شخص کس چیز کا اہل ہے اور کون کس چیز کے لیے طلب گار ہے جو چیز سامنے آتی الاٹ کر دیتے۔جب لوگ بے ڈھنگی الاٹ منٹ پر احتجاج کرتے ہیں تو پھر ان سے غیر متعلقہ الاٹ منٹ واپس لے کر کسی اور مہاجر کو دے دیتے اور پہلا شخص پھر سے محروم ہوتا۔علن ایک دکان دار تھا اور محکمہ سے ایک چھوٹی سی دکان کا خواہاں تھا مگر ''محکمہ بحالیات والوں کا یہ حال ہو رہا تھا کہ ان کے قہر کا ٹھیک تھا نہ مہر کا۔سخاوت اور بخل دونوں کا انھوں نے وہ اعجاز دکھایا کہ اگلے پچھلے سارے ریکارڈ مات ہو گئے۔جس پر مہربان ہوئے اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا اور جنھیں عنایت کا مستحق نہ سمجھا انھوں نے الاٹ منٹ کے دفتروں کی دہلیز کی خاک نہ چھوڑی اور پھر بھی پیاسے ہی لوٹے۔علن پر ایک مرتبہ عنایت ہوئی تھی مگر عجب انداز سے۔ایک انگریزی دواخانہ اس کے نام الاٹ کر دیا گیا اس پر ایک مہاجر کمپاؤنڈر نے بہت شور مچایا۔علن بھی اس بے ڈھب عنایت سے کچھ خوش نہ تھا۔مہاجر کمپاؤنڈر کے شور مچانے پر محکمہ کی سمجھ میں یہ تو آ گیا کہ انگریزی دواخانہ علن کے نام الاٹ نہیں ہونا چاہیے۔مگر اس کے بعد وہ اس مہاجر کمپاؤنڈر کو نہیں بلکہ ایک ہر چونئے کو الاٹ ہوا۔بہر حال علن اس جھک جھک سے بچ گیا۔اس کے بعد اس نے بہت دھوڑ دھوپ کی اور ایک ایک کلرک کی ہتھا جوڑی کی مگر پھر اس کی قسمت ٹس سے مس نہ ہوئی۔آخر فٹ پاتھ پر کباب بنانے لگا۔[۲۶]اُردو ناول نے علن اور اس جیسے بے شمار مہاجرین کس مسائل کو پیش کیا ہے۔یہ اور اس قسم کے بہت سے مسائل ہمارے اُردو ناول کا موضوع بنے ہیں اور اُردو ناول کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ ہمارے فاضل ناول نگاروں کی نظر سے

ہجرت کا واقع اوجھل نہیں ہوا۔ انھوں نے مختلف زاویوں سے اس بڑی انسانی نقل مکانی کو دیکھا، پرکھا اور اپنے مخصوص اسلوب میں قارئین کے سامنے پیش کر دیا۔ ناول کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کے ذریعے وہ مسائل بھی آج کی نسل کے سامنے آجاتے ہیں جو تاریخ کی کتب میں درج نہیں ہیں۔ یہی ایک کامیاب ناول کی نشانی ہے کہ وہ متوازی تاریخ مرتب کرتا ہے ۔ یہ تاریخ خودمختار ہوتی ہے اور زیادہ باریکی سے چیزوں کو نمایاں کرتی ہے۔

☆☆☆

حواشی

۱۔ انتظار حسین، ''بستی''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص:۹۴

۲۔ الطاف فاطمہ، ''چلتا مسافر''، لاہور: فیروز سنز، س ن، ص:۱۶۶

۳۔ عبداللہ حسین، ''نادار لوگ'' لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص:۳۱۳ تا ۳۱۸

۴۔ ایضاً

۵۔ انتظار حسین، ''بستی''، ص:۹۰

۶۔ ایضاً، ص:۱۰۳

۷۔ قرۃ العین حیدر، ''آگ کا دریا''، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص:۵۰۳

۸۔ ایضاً، ص:۵۰۲

۹۔ انتظار حسین، ''بستی''، ص:۲۰۱

۱۰۔ ڈاکٹر محمد افضال بٹ، ''اردو ناول میں سماجی شعور''، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء، ص:۲۸۴

۱۱۔ انتظار حسین، ''بستی''، ص:۹۵، ۹۶

۱۲۔ ایضاً، ص:۹۷

۱۳۔ الطاف فاطمہ، ''دستک نہ دو''، لاہور: فیروز سنز، س ن، ص:۳۱، ۳۲، ۷

۱۴۔ الطاف فاطمہ، ''چلتا مسافر''، ص:۱۶۱

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ ایضاً، ص:۳۱۹

۱۷۔ الطاف فاطمہ، ''چلتا مسافر''، ص:۱۴۳

۱۸۔ ایضاً،ص:۱۴۴

۱۹۔ ایضاً،ص:۱۵۶

۲۰۔ عبداللہ حسین،''نادار لوگ''،ص:۸۴،۸۵

۲۱۔ ایضاً ص:۹۳

۲۲۔ ایضاً،ص:۲۴۶،۲۴۷

۲۳۔ انتظار حسین،''چاند گہن''،لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء،ص:۱۲۴

۲۴۔ ایضاً،ص:۱۳۰

۲۵۔ ایضاً،ص:۱۳۱،۱۳۲

۲۶۔ ایضاً،ص:۱۳۹

☆☆☆